ڈاکٹر حافظ انس نضر[1]

تفسیر قرآن بذریعہ نظم قرآن
اور مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے تفسیری تفردات

Abstract

Mawlānā Farāhī is the founder of an independent school of thought with regards to the understanding and interpretation of Qur'ān in the subcontinent. The very foundation of this school rests with the cognition of 'Coherence in between the Qur'ānic verses. He considers Qur'ānic Coherence to be an essential tool in the Exegesis of Qur'an as compared to the conventional method of employing narrations and Aḥādīth.

In this paper, his some of those Exegetic diversions are discussed in which he relied solely on his personal understanding of Qur'ānic Coherence while disengaging from narration; especially those that in result did not match with any of the interpretations stated by the scholars of early generations. Similarly, the treatise also includes a comparative study of the Exegesis stated by the majority scholars of the classical school of thought and the selected interpretations of Mawlānā Farāhī' along with the predominant opinion in the subject matter.

مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1930م) نے اپنی تفاسیر میں جن اصولوں کو بنیاد بنایا ہے، ان میں سے ایک 'نظم قرآن' بھی ہے۔ وہ تفسیر کرتے وقت سورت یا آیت کا ماقبل ومابعد اس طرح مد نظر رکھتے ہیں کہ ان

[1] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، یونیورسٹی آف لاہور، لاہور

کے درمیان ایک معنوی ربط اور مناسبت قائم کر دیتے ہیں، جس کو وہ سورت کا مرکزی مضمون یا عمود سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی اس انداز میں کی گئی تفسیر قرآن فہمی کے لئے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور علم تفسیر میں بحث و نظر کے نئے دروازے کھلتے ہیں۔ مگر مولانا نے بعض مقامات پر ان اصولوں کی بنیاد پر ایسی تفسیر کر ڈالی ہے جو جمہور مفسرین کے مطابق منشائے متکلم سے ہٹ کر اور منفرد ہے۔ ذیل میں چند مثالیں ذکر کرتے ہیں، جن میں مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے منفرد تفسیر کی ہے۔

سورۃ اللّھب کی تفسیر

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ سورۃ اللّھب کو ابولہب کے خلاف بد دعا نہیں بلکہ فتح مکہ کی بشارت قرار دیتے ہیں جبکہ جمہور مفسرین کے نزدیک یہ ابولہب کے قول: "تبّا لك یا محمّد" کے جواب میں نازل ہوئی ہے۔ ابولہب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بد دعا دی تھی تو اللہ تعالیٰ نے انہی کلمات کے ساتھ وہ بد دعا ابولہب پر بطور عتاب نازل فرمادی۔

موقف فراہی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۃ اللّھب کو ابولہب کے خلاف بد دعا نہیں بلکہ فتح مکہ کی بشارت قرار دیا ہے۔ انہوں نے یہ رائے نظم قرآن کے اصول پر قائم کی ہے اور اپنی کتاب 'مجموعہ تفاسیر فراہی' میں ماقبل و مابعد سورتوں کا نظم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کہ خداوند تعالیٰ نے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت فتح مکہ پر تمام کی، اسی طرح آپ کے صحیفہ نبوت کو اس فتح عظیم کے ذکر پر ختم کیا۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ حق اپنے مرکز پر پہنچ گیا کیونکہ کعبہ کے مرکز توحید و اسلام ہونے کی وجہ سے (جیسا کہ تفسیر سورہ بقرہ میں ہے) فتح مکہ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مرکز تھی۔ اس کے بعد صرف اثبات اور استقامت کی ضرورت تھی، اس کے لئے تین سورتیں اس کے بعد لگا دی گئیں، سورہ اخلاص، جو تمام معارف توحید کا خزانہ ہے، یہ واضح کرنے کے لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غایت توحید ہے اور دونوں معوذتین دعائے استقامت کی تلقین کے لئے۔ اس ربط کی ایک لطیف مثال اس آیت میں بھی ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ ﴾[1] "جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر جمے رہے، ان پر ملائکہ یہ بشارت لے کر اترتے ہیں کہ نہ خوف کرو نہ غم اور تمہارے لئے اس بہشت کی خوشخبری ہے جس کا وعدہ کئے جاتے رہے ہو۔" اس تمہید سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ تمام سورتیں (سورہ نصر، سورہ اخلاص اور معوذتین) باہم مربوط ہیں۔ اس وجہ سے سورہ لہب کا ان کے درمیان رکھا جانا کسی خاص سبب و حکمت ہی پر مبنی

[1] سورۃ فصلت: 30:41

ہو سکتا ہے، ورنہ پورا سلسلہ نظم درہم برہم ہو جائے گا۔ چنانچہ غور و فکر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سورہ نصر میں جس فتح و غلبہ کا ذکر ہے، سورہ لہب میں اسی فتح و غلبہ کی وضاحت اور بشارت ہے۔ گویا یوں فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے پیغمبر کو غلبہ دیا اور اس کے دشمن کو برباد کیا، جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴾[1] "کہہ دیجئے حق نمودار ہوا اور باطل مٹ گیا بلاشبہ باطل مٹنے ہی کی چیز ہے۔" اس قسم کے نظم کی نہایت لطیف مثال آنحضرت ﷺ کے اس خطبہ میں بھی ہے جو آپ نے فتح مکہ کے موقع پر کعبہ کے دروازے پر دیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: « لَا إله إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ صَدَقَ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَه وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ »[2] "خدائے واحد کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندہ کی مدد فرمائی اور یکتا و تنہا دشمنوں کی جماعتوں کو شکست دی۔" بظاہر یہ تین الگ الگ فقرے ہیں، لیکن ایک صاحب نظر کے لئے ان تینوں جملوں کے اندر علی الترتیب تین سورتوں کے مضامین پنہاں ہیں، پہلا فقرہ « لَا إله إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ » سورہ کافرون کا ہم مضمون ہے۔ دوسرا جملہ « صَدَقَ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَه » سورہ نصر کے ہم معنی ہے، تیسرا جملہ « وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ » اور سورہ لہب ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ پس جس طرح یہ تینوں فقرے ایک صاحب نظر کے لئے بالکل مربوط و منظم ہیں، اسی طرح جو لوگ ان تمام سورتوں کے مضامین پر غور کریں گے وہ ان سب کو ایک ہی زنجیر کی بالکل مربوط کڑیوں کی شکل میں پائیں گے۔"[3]

جمہور مفسرین کا رد کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

"عام خیال یہ ہے کہ ابولہب نے نبی کریم ﷺ کو مخاطب کر کے کہا تھا: "تبّا لك ألهذا دعوتنا؟" کہ تم ہلاک ہو، تم نے ہم کو اسی لئے بلایا ہے، اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ابولہب اور اس کی بیوی کی مذمت میں یہ سورت نازل فرمادی تاکہ نبی کریم ﷺ کو ابولہب کی گستاخی سے جو رنج پہنچا تھا وہ رفع ہو جائے، لیکن صحیح تاویل روشن ہو جانے کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس رائے کو قبول کریں۔"[4]

مزید لکھتے ہیں:

"اب ایک قدم اور آگے بڑھ کر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ سورۃ اوائل بعثت میں نہیں اتری ہے۔ جو لوگ اس دلیل کی بناء پر کہ یہ ابولہب کی سخت کلامی کا جواب ہے۔ اس کا زمانہ نزول ابتدائے بعثت بتلاتے ہیں ہمارے نزدیک ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ یہ سورۃ ابولہب کے جواب میں نہیں بلکہ ایک ہونے والے واقعہ کی پیشین گوئی اور

---

[1] سورۃ الإسراء: 81:17

[2] أبوداؤد، سليمان بن الأشعث، سنن أبي داؤد، كتاب الديات، باب في دية الخطأ شبه العمد: 4547، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الأولى، 1999م

[3] فراہی، حمید الدین، مجموعہ تفاسیر فراہی، مترجم امین احسن اصلاحی: 490، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، 1973

[4] أیضاً: ص493

خبر ہے۔"[1]

جمہور مفسرین کے نزدیک منشائے متکلم

جمہور مفسرین کے نزدیک یہ سورت ابتدائے بعثت کے موقع پر نازل ہوئی ہے جب نبی کریم ﷺ نے قبائل قریش کو صفا پہاڑی پر بلا کر توحید کا پیغام دیا تو ابولہب نے کہا: "تبّا لك ألهذا جمعتنا" تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کا غم ہلکا کرنے کے لئے اس کے جواب میں یہ سورت نازل فرمائی کہ جس میں ابولہب کی سخت کلامی کی مذمت کی گئی ہے۔ بطور نمونہ چند معروف تفاسیر ملاحظہ فرمائیں۔

① امام طبری رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 310ھ) اس سورت مبارکہ کی تفسیر میں متعدد روایات نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خسرت يدا أبي لهب وخسر هو، وإنما عنى بقوله ﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ۝﴾ تبّ عمله، وكان بعض أهل العربية يقول: ﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ۝﴾ قوله: دعاء عليه من الله."

"ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ خود خاک آلود ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول ﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ۝﴾ سے مراد اس کے عمل کی تباہی و بربادی ہے۔ بعض اہل عرب کہتے تھے کہ اس آیت مبارکہ ﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ۝﴾ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے خلاف بد دعا ہے۔"[2]

امام طبری رحمۃ اللہ علیہ اس سورۂ مبارکہ کے شان نزول میں متعدد روایات نقل کرتے ہیں کہ جن میں سے ایک یہ ہے:

"سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک دن صفا پہاڑی پر چڑھ گئے اور قریش مکہ کو پکارا: جب قریش کے لوگ جمع ہو گئے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: « أَرَأَيْتَكُمْ إِنْ أَخْبَرْتُكُمْ أَنَّ الْعَدُوَّ مُصْبِحُكُمْ أَوْ مُمْسِيكُمْ أَمَا كُنْتُمْ تُصَدِّقُونَنِي » "تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر میں تمہیں خبر دوں کہ تمہارا دشمن صبح یا شام کو تم پر حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! تب نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں تمہیں اس سے بھی سخت عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ کہہ دو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ کامیاب ہو جاؤ گے۔ عرب و عجم کے مالک بن جاؤ گے۔ یہ سن کر ابولہب بولا: "تبّا لك ألهذا دعوتنا وجمعتنا." کہ تیرے لئے ہلاکت ہو، کیا تو نے اس لئے ہمیں بلایا تھا اور جمع کیا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ابولہب کے جواب میں یہ سورت ﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ۝﴾ نازل فرما دی۔"[3]

پس صحابہ اور متقدمین مفسرین کے نزدیک یہ سورت ابولہب کے جواب اور مذمت میں اتری ہے اور یہ اس

---

[1] مجموعہ تفاسیر فراہی: ص510

[2] الطبري، محمد بن جرير، جامع البيان: 12 / 733، دار السلام، قاهرة، 2008م

[3] جامع البيان: 12 / 734

کے خلاف بد دعا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 516ھ) اس سورت کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں:

"سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صفا پہاڑی پر چڑھے اور یا صباحاہ (عرب یہ کلمہ خطرہ کے وقت پکارتے تھے تاکہ سب لوگ متنبہ ہو جائیں) کہا۔ چنانچہ قریش والے آپ کے پاس جمع ہو گئے۔ انہوں نے آپ سے پوچھا: کیا معاملہ ہے؟ آپ نے فرمایا: « أَرَأَيْتَكُمْ إِنْ أَخْبَرْتُكُمْ أَنَّ الْعَدُوَّ مُصْبِحُكُمْ أَوْ مُمسِيكُمْ أَمَا كُنْتُمْ تُصَدِّقُونَنِي » کہ تمہارا کیا خیال ہے اگر میں تمہیں خبر دوں کہ دشمن صبح یا شام کے وقت حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم مجھے سچا ماننے والے ہو۔ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! تب آپ نے فرمایا: میں تمہیں آخرت کے شدید عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ یہ سن کر ابو لہب بولا: " تبّا لك ألهذا جمعتنا." چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں یہ سورت ﴿ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ۝ ﴾ نازل فرمادی۔"[1]

اس سے معلوم ہوا کہ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی یہ سورت ابو لہب کے خلاف بد دعا اور اس کی سخت کلامی کا جواب ہے۔ اسی طرح علامہ جار اللہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 538ھ) اس سورت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں:

"التباب" کا معنیٰ ہلاکت ہے، یعنی وہ ہلاک ہو گیا۔[2] جب سورۃ شعراء کی آیت مبارکہ ﴿ وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ ﴾[3] نازل ہوئی کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا پہاڑی پر چڑھ کر (یا صباحاہ) کی آواز لگائی۔ جب ہر طرف سے لوگ آپ کے پاس جمع ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « يَا بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، يَا بَنِي فِهْرٍ! إِنْ أَخْبَرْتُكُمْ أَنَّ بِسَفْحِ هٰذَا الْجَبَلِ خَيْلًا أَكُنْتُمْ مُصَدِّقِيَّ ؟ » "اے بنو عبد المطلب، اے بنو فہر، اگر میں تمہیں خبر دوں کہ اس پہاڑ کے دامن میں ایک لشکر (چھپا ہوا) ہے تو کیا تم میری تصدیق کرنے والے ہو، انہوں نے کہا: ہاں: تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تمہیں قیامت سے ڈرانے والا ہوں۔ یہ سن کر ابو لہب بولا: "تبّا لك ألهذا دعوتنا." چنانچہ ابو لہب کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی۔"[4]

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 606ھ) اس سورت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دن کے وقت ابو لہب کو اسلام کی دعوت دی، مگر اس نے انکار کر دیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا نوح علیہ السلام کی سنت پر عمل کرتے ہوئے رات کو دوبارہ ابو لہب کے گھر گئے۔ جب آپ اس کے گھر میں داخل ہوئے تو اس نے کہا: کیا آپ معذرت کرنے آئے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم محتاج کی مانند اس کے

---

[1] البغوی، الحسین بن سعود، معالم التنزیل: 6/528، دار الکتب العلمیة، بیروت، 1995م

[2] الزمخشري، محمود بن عمر، الكشاف عن حقائق التنزيل وعيوم الأقاويل في وجوه التأويل: 4/ 819، دار إحياء التراث العربي، بيروت

[3] سورۃ الشعراء: 214:26

[4] الكشاف: 4/ 819، 820

سامنے بیٹھ گئے اور اسے اسلام کی دعوت دیتے ہوئے کہا: اگر دن کو تجھے عار نے اسلام لانے سے روکا تھا تو اب اس وقت میری دعوت کو قبول کر لے اور خاموش رہ۔ ابولہب نے کہا: میں اس وقت تک تجھ پر ایمان نہ لاؤں گا جب تک یہ جدی (بکری کا بچہ) تجھ پر ایمان نہ لے آئے۔ نبی کریم ﷺ نے جدی (بکری کا بچہ) سے پوچھا: میں کون ہوں؟ اس نے کہا: اللہ کے رسول! نیز اس نے رسول اللہ ﷺ کی تعریف کرنا شروع کر دی۔ جس پر ابولہب پر حسد غالب آگیا، اس نے جدی کا ہاتھ پکڑا اور اسے زور سے مروڑا اور کہا: "تبّا لك أثر فيك السّحر" تو جدی (بکری کے بچہ) نے بھی آگے سے کہا: "بل تبّا لك" چنانچہ اسی کے موافق یہ سورۃ نازل ہوئی۔"[1]

تفسیر رازی میں اگرچہ قصّہ مختلف ہے مگر اس میں بھی ابولہب کی مذمت اور اس کے خلاف بد دعا کا ہی تذکرہ ہے۔ امام ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 542ھ) اس سورت کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں:

"حدیث مبارکہ میں مروی ہے کہ جب سورۃ شعراء کی یہ آیت مبارکہ ﴿وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ ۙ﴾[2] نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: « يَا صَفِيَّةُ بِنْتُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، يَا فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ! لَا أَمْلِكُ لَكُمَا مِنَ اللهِ شَيْئًا، سَلَانِي مِن مَالِي مَا شِئْتُمَا » کہ اے صفیہ بنت عبد المطلب، اے فاطمہ بنت محمد ﷺ! میں اللہ تعالیٰ سے تمہارے بارے میں کسی قسم کا کوئی اختیار نہیں رکھتا البتہ تم دونوں مجھ سے میرے مال میں سے جو چاہتی ہو مانگ لو۔ پھر رسول اللہ ﷺ صفا پہاڑی پر چڑھ گئے اور خواص قریش کو پکارا: « يَا بَنِي فُلَان، يَا بَنِي فُلَان » کہ اے بنو فلاں! اے بنو فلاں! ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے بلند آواز سے "یا صباحاہ" کہا، ہر طرف سے لوگ آپ کے پاس جمع ہو گئے۔ آپ ﷺ نے ان سے کہا: « أَرَأَيْتُمْ لَوْ قُلْتُ لَكُمْ إِنِّي أُنْذِرُكُمْ خَيْلًا بِسَفْحِ هٰذَا الْجَبَلِ أَكُنْتُمْ مُصَدِّقِيَّ؟ » کہ تمہارا کیا خیال ہے اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کے دامن میں موجود لشکر سے ڈر جاؤ، تو کیا تم میری تصدیق کرنے والے ہو۔ انہوں نے کہا: ہاں! تب نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں تمہیں آخرت کے شدید عذاب سے ڈراتا ہوں۔ یہ سن کر ابولہب بولا: "تبّالك سائر اليوم ألهذا جمعتنا" جب لوگ آپ کے پاس سے متفرق ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرما دی۔"[3]

مذکورہ بالا تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت ابولہب اور اس کی بیوی کی مذمت میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں ابولہب کی سخت کلامی کا جواب ہے اور اس کے خلاف بد دعا ہے، مفسرین میں سے کسی نے بھی اس سورت کو فتح مکہ کی بشارت قرار نہیں دیا۔ اس سورت کو فتح مکہ کی بشارت قرار دینا صرف مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی انفرادیت

---

[1] الرازي، فخر الدين، محمد بن عمر، مفاتيح الغيب: 32/ 167، دار الكتب العلمية، طهران

[2] سورة الشعراء:26: 214

[3] ابن عطية، عبد الحق الأندلسي، المحرر الوجيز في تفسير الكتب العزيز: 15/ 594-595، قطر، 1984م

ہے۔اس رائے میں ان کا کوئی بھی ہم نوا نہیں ہے۔

تفسیر سورہ عبس

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ سورۃ عبس کی تفسیر میں اس امر کے انکاری ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نابینا صحابی سیدنا عبد اللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ سے اعراض کرنے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب کیا ہے۔ نیز وہ اس بات کو بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ مذکورہ صحابی آپ سے کچھ سیکھنے کے لئے آئے تھے اور جن روایات میں "علمني مما علمك الله" کے الفاظ ہیں وہ ایسی روایات کو یکسر مسترد کر دیتے ہیں۔ جبکہ جمہور مفسرین کے نزدیک اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم علیہ السلام کو توجہ دلائی ہے اور متعدد روایات سے یہ ثابت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ نیز ان کا تعلیم حاصل کرنے کے لئے آنا یا ویسے ہی آنا بنیادی مسئلہ نہیں تھا بلکہ اصل تنبیہ تو اس امر پر نازل ہوئی ہے کہ آپ نے ان سے اعراض کرتے ہوئے قریش مکہ کو ترجیح دی کہ شاید وہ اسلام قبول کر لیں۔

مؤقف فراہی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سورہ عبس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے، کفار کو عتاب ہے۔ نیز سید عبد اللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ کچھ سیکھنے کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ ویسے ہی چلے آئے تھے اور یہاں اللہ تعالیٰ کے عتاب کا رخ کفار کی طرف ہی ہے اور ان کے بقول اللہ عزوجل نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ و دعوت میں اصرار کی اس حد سے روکا ہے جو آپ کے منصب کے شایان شان نہیں ہے۔ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب 'مجموعہ تفاسیر فراہی' میں اس سورہ کا عمود (یعنی نظم) بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ سورۃ منذرات میں سے ہے۔ یعنی ان سورتوں میں سے ہے جو مخاطب کو جھنجوڑنے اور بیدار کرنے کے لئے نازل ہوئی ہیں۔ ابتدائے بعثت کی اکثر سورتوں کا یہی حال ہے۔ البتہ ان کے اسلوبِ بیان مختلف ہو گئے ہیں۔ مثلاً اسی سورہ میں انذار کا ایک نیا پہلو یہ اختیار کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کے پیچھے وقت ضائع کرنے سے روکا گیا ہے جو انکار اور نافرمانی پر اڑے ہوئے ہیں اور کسی طرح اپنی جگہ چھوڑنا نہیں چاہتے۔ پھر اسی مضمون سے متعلق آگے چل کر، کچھ اور باتیں آگئی ہیں۔ مثلاً چند لفظوں میں ان کی ہٹ دھرمی پر ملامت ہے۔ پھر ان کی ضد اور بے پروائی کی خرابیاں بیان ہوئی ہیں۔ پھر ان کے انجام کی تفصیل ہے اور آخر میں مقابلہ کے اسلوب پر ان لوگوں کا بھی ذکر آگیا ہے جنہوں نے ان سے الگ ہو کر ایمان و اطاعت کی راہ اختیار کر لی ہے۔ اس اسلوب کے چند فوائد قابل ذکر ہیں۔ مثلاً: 1۔ توضیح مطلب کے لئے مخالف پہلو کا ذکر مفید ہوا کرتا ہے۔ 2۔ اس میں ترتیب کے ساتھ ترغیب کا پہلو بھی پیدا ہو گیا ہے جو ایک جامع اور موثر انداز کلام ہے۔ 3۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کو اشارہ ہے کہ آپ کی توجہ کے اصل مستحق مومنین ہیں نہ کہ کفار۔ مومنین کا حق مقدم ہے۔ سابق سورہ سے اس کا ربط یوں ہے کہ اس کے خاتمہ کی آیت ﴿ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ﴾[1] تھی۔ یعنی کہ تمہاری نصیحتوں کو وہی قبول کر سکتے ہیں جو قیامت سے ڈرتے ہیں۔ پس اس سورہ میں یہ بتا دیا کہ پیغمبر ایسے لوگوں سے اصرار و لجاجت کرنے پر مامور نہیں ہے جو قیامت کے خوف سے بے پرواہ ہو چکے ہوں۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ انتہائی رافت و شفقت کے سبب سے، یا جوش تبلیغ و دعوت میں، کبھی کبھی اصرار و لجاجت پر اتر آتے تھے۔ یہاں بھی وہی مضمون ہے۔ قرآن مجید نے تعلیم کو موثر اور دل نشین بنانے کے لئے، نابینا کے مناسب حال واقعہ کو بطور مثال اختیار کر لیا ہے اور پیغمبر ﷺ کو تبلیغ و دعوت میں اصرار کی اس حد سے روکا ہے جو آپ کے منصب کے شایان شان نہیں ہے اور گو کلام کا ظاہر اسلوب تنبیہ و عتاب کا ہے لیکن در حقیقت ان تمام مواقع میں جہاں آنحضرت ﷺ کو منکرین سے اعراض کا حکم دیا جاتا ہے، غصہ و عتاب کا اصلی رخ پیغمبر ﷺ کے بجائے منکرین ہی کی طرف ہوتا ہے اور یہ اتمام دعوت کا ایک نہایت معروف اسلوب ہے جس سے اہل نظر ناواقف نہیں ہو سکتے۔ سورہ کی یہ تاویل جو بالا جمال اوپر بیان ہوئی بالکل واضح ہے اور کسی صاحب بصیرت کو اس کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہو سکتی لیکن بعض مفسرین سے اس کی تاویل میں لغزش ہو گئی ہے جس کو ہم آگے بیان کریں گے لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ایک فصل میں انبیاء کے خُلق عظیم پر روشنی ڈالیں اور یہ واضح کر دیں کہ کبھی کبھی جو ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے باندازِ عتاب مخاطب کیا جاتا ہے تو اس عتاب کا اصلی پہلو کیا ہوتا ہے۔"

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے اس مؤقف کو واضح کرنے کے لئے ایک مثال کا سہارا لے کر واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ عتاب در حقیقت نبی کریم ﷺ کو نہیں بلکہ کفار کو ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"اس معاملہ کی اصل نوعیت کو ایک مثال سے سمجھو۔ فرض کرو ایک نہایت مستعد اور ذمہ دار چرواہا ہے۔ اس کے گلے کی کوئی فربہ بھیڑ گلے سے الگ ہو کر کھو جائے۔ چرواہا اس کی تلاش میں نکلے۔ ہر قدم پر اس کے کھر کے نشانات ملتے جا رہے ہیں۔ جنگل کے کسی گوشہ سے اس کی آواز بھی سنائی دے رہی ہے اور اس طرح وہ کامیابی کی امید میں دور تک نکل جاتا ہے اور اپنے اصلی گلے سے تھوڑی دیر کے لئے غافل ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ واپس لوٹتا ہے تو اس کا آقا اس کو ملامت کرتا ہے کہ تم پورے گلے کو چھوڑ کر ناحق ایک دیوانی بھیڑ کے پیچھے ہلکان ہوئے۔ اس کو چھوڑ دیتے، بھیڑیا کھا جاتا وہ اسی کی مستحق تھی۔ بتاؤ اس میں عتاب کس پر ہوا، چرواہے یا کھوئی ہوئی بھیڑ پر۔ ظاہر ہے کہ کھوئی ہوئی بھیڑ پر، چرواہے اور گلے کی تو اس میں زیادہ سے زیادہ دلداری ہوئی۔ بالکل یہی صورت معاملہ یہاں بھی ہے۔ عتاب کا روئے سخن بظاہر آنحضرت ﷺ کی طرف ہے۔ لیکن خفگی کا

[1] سورۃ النازعات: 45:79

تمام زور منکرین و معاندین پر پڑ رہا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے لئے تو اس عتاب کے اندر شفقت والتفات کی نہایت جان نواز ادائیں پنہاں ہیں۔"

لیکن مولانا صاحب کی اس مثال کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اس مثال میں چرواہے ہی کو توجہ دلائی جائے گی کیونکہ پورے گلے سے غفلت برتتے ہوئے ایک دیوانی بھیڑ کے پیچھے چلے جانا درست نہیں ہے۔ ایک بھیڑ کو بچاتے ہوئے پورے گلے کو درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا بھی درست نہیں ہے۔

جمہور مفسرین کا موقف

جمہور مفسرین کے نزدیک سورہ عبس میں نبی کریم ﷺ پر عتاب ہے کیونکہ آپ ﷺ نے سیدنا عبد اللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ کو نظر انداز کرتے ہوئے کفار کو ترجیح دی تھی اس سلسلے میں جمہور مفسرین کی تفاسیر درج ذیل ہیں:

① امام طبری رحمۃ اللہ علیہ سورۃ عبس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وذكر أن الأعمى الذى ذكر الله في هذه الآية، هو ابن أم مكتوم، عوتب النبى ﷺ بسببه."[1]

"جس نابینا صحابی کا تذکرہ اس آیت مبارکہ میں کیا گیا ہے وہ ابن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ ہیں جن کے سبب نبی کریم ﷺ کو عتاب کیا گیا۔"

اس کے بعد امام طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سورت کا شان نزول بیان کرتے ہوئے متعدد روایات نقل کی ہیں:

"سیدۃ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ سورت عبس سیدنا عبد اللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ نبی کریم ﷺ کے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے "أرشدنی" کہ آپ میری راہنمائی فرمائیں۔ اور رسول اللہ ﷺ کے پاس مشرک سردار بیٹھے ہوئے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے سیدنا ابن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ سے اعراض کرتے ہوئے ان سرداروں کے ساتھ گفتگو کو ترجیح دی۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل کر دی۔"[2]

مذکورہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے کچھ سیکھنے اور پڑھنے آئے تھے، اور اس سورت مبارکہ میں نبی کریم ﷺ پر آپ کے اس رویے کی وجہ سے عتاب ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ اس سورت کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں:

"اس سورت مبارکہ میں نابینا سے مراد سیدنا عبد اللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ ہیں۔ جب وہ نبی کریم ﷺ کے پاس تشریف لائے تو اس وقت رسول اللہ ﷺ کفار مکہ کے سرداروں عتبہ بن ربیعہ، ابو جہل بن ہشام، عباس بن عبد المطلب، ابی بن خلف اور اس کے بھائی اُمیہ بن خلف سے گفتگو کر رہے تھے۔ انہیں اللہ کی طرف بلا رہے

[1] جامع البيان: 12/ 443

[2] أيضاً: 12/ 443

تھے اور اسلام کی دعوت دے رہے تھے۔ سیدنا عبد اللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ آئے اور کہا: یارسول اللہ ﷺ! "أقرئني وعلمني مما علمك الله" کہ مجھے پڑھائیں اور جو کچھ آپ کو اللہ نے سکھلایا ہے، مجھے بھی سکھلائیں۔ وہ بار بار یہ کلمات کہہ رہے تھے اور انہیں معلوم نہیں تھا کہ نبی کریم ﷺ کسی اور کی طرف متوجہ ہیں۔ ان کے اس رویے کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کے چہرے پر کچھ ناپسندیدگی ظاہر ہونے لگی۔ آپ ﷺ نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ سردار کہیں گے کہ محمد ﷺ کے پیروکار نابینا، غلام اور غیر مہذب لوگ ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے تیوری چڑھا کر ان سے منہ موڑ لیا اور ان سرداروں کے ساتھ گفتگو کرنے لگے کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات مبارکہ نازل فرمادیں۔ ان آیات کے نزول کے بعد نبی کریم ﷺ ان سے انتہائی عزت واحترام سے ملتے اور جب بھی ان کو دیکھتے تو کہتے: «مرحبا بمن عاتبني فيه ربي» کہ خوش آمدید ایسے شخص کو، جس کی وجہ سے میرے رب نے مجھے عتاب کیا۔ اللہ کے نبی ہمیشہ ان سے پوچھتے رہتے۔ «هل من حاجة» کہ کیا تمہاری کوئی ضرورت تو نہیں ہے؟ نبی کریم ﷺ نے دو غزوات کے موقع پر ان کو مدینہ پر اپنا نائب مقرر کیا۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے انہیں جنگ قادسیہ کے دن دیکھا کہ انہوں نے سیاہ جھنڈا اٹھایا ہوا تھا اور زرہ پہنی ہوئی تھی۔"[1]

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اس سورت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"نبی کریم ﷺ کے پاس سیدنا عبد اللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ آئے۔ اُم مکتوم آپ کی دادی کا نام ہے اور آپ کا پورا نام عبد اللہ بن شریح بن مالک بن ربیعہ الفہری ہے اور نبی کریم ﷺ کے پاس قریش کے سرداران عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابو جہل بن ہشام، عباس بن عبد المطلب، امیہ بن خلف اور ولید بن مغیرہ موجود تھے۔ آنحضرت ﷺ ان کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے کہ شاید وہ مسلمان ہو جائیں۔ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور بار بار کہنے لگے «أقرئني و علمني مما علمك الله» کہ آپ مجھے پڑھائیں اور جو کچھ اللہ نے تجھے سکھلایا ہے اس میں سے مجھے بھی سکھلائیں۔ پس نبی کریم ﷺ نے ان کے قطع کلامی کرنے کو ناپسند کیا اور تیوری چڑھاتے ہوئے ان سے منہ موڑ لیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات مبارکہ نازل فرمادیں۔ ان آیات کی نزول کے بعد نبی کریم ﷺ ان کی تکریم کرتے اور جب بھی ان کو دیکھتے تو کہتے، «مرحبا بمن عاتبني فيه ربي» کہ خوش آمدید! ایسے شخص کو، جس کی وجہ سے میرے رب نے مجھ پر عتاب نازل کیا۔ اور ان سے پوچھتے رہتے تھے: (هل من حاجة) کہ کیا کوئی حاجت ہے، نبی کریم ﷺ نے دو مرتبہ ان کو مدینہ پر نگران مقرر کیا۔"[2]

---

[1] معالم التنزيل: 6/ 365، 366

[2] مفاتيح الغيب: 31/ 54

علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ اس سورت کی تفسیر میں رقم طراز ہیں:

"نبی کریم ﷺ کے پاس سیدنا ابن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ آئے۔ اُم مکتوم ان کی دادی کا نام ہے۔ اور ان کا نام عبد اللہ بن شریح بن مالک ابن ربیعہ الفہری من بنی عامر بن لوی ہے اور آپ ﷺ کے پاس سردار قریش عتبہ، شیبہ ابن ربیعہ، ابو جہل بن ہشام، عباس بن عبد المطلب، امیہ بن خلف اور ولید بن مغیرہ موجود تھے۔ آپ ﷺ ان کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے شاید کہ وہ مسلمان ہو جائیں اور ان کی وجہ سے دیگر لوگ مسلمان ہو جائیں۔ سیدنا ابن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ نے بار بار یہ کہنا شروع کر دیا: «أقرئني وعلمني مما علمك الله» کہ آپ مجھے پڑھائیں اور جو کچھ آپ کو اللہ تعالیٰ نے سکھلایا ہے اس میں سے مجھے بھی سکھلائیں۔ ان کو نہیں معلوم تھا کہ آپ قوم کے ساتھ مشغول ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ان کی طرف سے قطع کلامی کرنے کو ناپسند کیا اور تیوری چڑھاتے ہوئے ان سے منہ پھیر لیا۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات مبارکہ نازل فرمادیں۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ ان کی تکریم کیا کرتے تھے اور جب بھی انہیں دیکھتے کہتے: «مرحبا بمن عاتبني فيه ربي» کہ خوش آمدید ایسے شخص کو جس کی وجہ سے میرے رب نے مجھے ڈانٹا۔ اور ان سے پوچھتے «هل من حاجته» کہ کیا کوئی حاجت ہے؟ نبی کریم ﷺ نے دو مرتبہ ان کو مدینہ کا نگران مقرر کیا۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے انہیں جنگ قادسیہ والے دن زرہ پہنے ہوئے دیکھا اور اس وقت ان کے ہاتھ میں سیاہ جھنڈا تھا۔"[1]

امام ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ اس سورت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"''العبوس'' کا معنی ہے کسی امر کی ناپسندیدگی کے وقت چہرے پر تیوری چڑھانا اور اس کے خطاب میں غائب کا صیغہ لانا عتاب میں مبالغہ ہے کیونکہ اس میں بھی اعراض کا کچھ شائبہ پایا جاتا ہے۔ متعدد اہل علم، ابن زید اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم یہ فرماتے ہیں اگر نبی کریم ﷺ وحی میں سے کچھ چھپاتے تو ان آیات مبارکہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا و زید رضی اللہ عنہ کے قصے والی آیات مبارکہ کو ضرور چھپا لیتے۔"[2]

تفسیر سورۃ ذاریات

مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورہ ذاریات کا ایک عمود (نظم) بنایا ہے اور اس میں اقوام کی تباہی میں ہواؤں کے کردار پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ان کے نزدیک قوم لوط، قوم نوح اور قوم فرعون پر عذاب ہوا کے ذریعہ آیا تھا۔ وہ قوم لوط پر برسنے والی پتھروں کی بارش کو بھی ہوا کا ہی شاخسانہ قرار دیتے ہیں۔ نیز ان کا مؤقف ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام دریائے قلزم پر آئے تو اللہ تعالیٰ نے ہوا کے ذریعے ہی اس کا سارا پانی خشک کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام پار

[1] الكشاف: 4/ 701

[2] المحرر الوجيز: 15/ 316

گزر گئے۔ طوفان نوح کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ہوا نے سمندری پانی کو اٹھا کر خشکی پر پھینک دیا تھا جس سے سیلاب آگیا جبکہ جمہور مفسرین کے نزدیک ان تمام اقوام پر آنے والے عذابوں کی تفصیلات مختلف ہیں۔ جن کا بیان آگے آرہا ہے۔

مؤقف فراہی رحمۃ اللہ علیہ

جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے کہ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر قرآن میں نظم قرآن (جس کو وہ عمود کا نام دیتے ہیں) کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اسی اصول کے تحت سورہ ذاریات کا ایک عمود قائم کیا ہے اور اس میں ہواؤں کے ذریعے جزا و سزا کے کردار پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ان کے نزدیک ہواؤں کے تصرفات اور ان کے فرق و امتیازی نیرنگیاں عجیب و غریب ہیں۔ ایک قوم کے ساتھ ان کا معاملہ کچھ اور ہوتا ہے جبکہ دوسری قوم کے ساتھ کچھ اور۔ کسی قوم کے لئے یہ ابر کرم کی بشارت بن کر نمودار ہوتی ہے اور کسی قوم کے لئے طوفان عذاب بن کر۔ ہواؤں کے کردار پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"ہواؤں اور بادلوں کے تصرفات عجیب و غریب صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ کبھی ہوائیں اٹھتی ہیں، بوجھل بادلوں کی مشکیں اپنی پیٹھوں پر لادتی ہیں اور ان کو چٹیل میدانوں میں لے جاکر جل تھل کر دیتی ہیں۔ کبھی سمندروں میں سامان سے بھری ہوئی کشتی کو کہتے ہیں جن سے تجارت و معیشت کے لئے بے شمار فوائد ظہور میں آتے ہیں، کبھی ریگستانوں سے حاصب بن کر ابھرتی ہیں اور آباد بستیوں کو ریت اور پتھروں سے ڈھانک دیتی ہیں۔ کبھی مرمر بن کر اولے اور کڑک کے عذاب کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ کبھی طوفان بن کر سیلاب انگیز بارشیں لاتی ہیں اور سمندروں میں ہیجان پیدا کر دیتی ہیں۔ ہواؤں اور بادلوں کی یہی مختلف حالتیں ہیں جن کو قرآن نے "تقسیم أمر" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت اور اس کے اختیار و تصرف کی ایک عجیب شان ہے کہ وہ کبھی ہوا کی تندی اور شدت کو ایک قوم کے لئے نجات کا ذریعہ بنا دیتا ہے اور کبھی اس کی نرمی اور اس کے سکون سے اس کو تباہ کر دیتا ہے۔ اس کی بہترین شہادت فرعون اور اس کے لشکر کی سرگزشت میں موجود ہے۔"[1]

قوم نوح کی تباہی تند ہوا کے ذریعہ سے واقع ہوئی

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ 'قوم نوح' کی تباہی میں ہواؤں کے کردار پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جس طرح دوسری قوموں کو اللہ تعالیٰ نے عذاب میں پکڑا اسی طرح نوح علیہ السلام کی قوم کو بھی عذاب میں پکڑا۔ لیکن قرآن اور تورات میں ان کی تباہی سے متعلق جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان پر غور کرنے سے یہ

[1] مجموعہ تفاسیر فراہی: ص102۔ 103

حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان کی تباہی میں بھی اصل دخل ہوا کے تصرفات ہی کو رہا ہے۔ چنانچہ سورہ عنکبوت میں ارشاد ہے: ﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ﴾[1] اور ہم نے نوح علیہ السلام کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان کے اندر پچاس سال کم ایک ہزار سال رہا۔ پس ان کو پکڑا طوفان نے اور وہ ظالم تھے۔ اس میں طوفان کا لفظ خاص طور پر لائق غور ہے۔ طوفان کے لغوی معنی دوران یعنی گردش کرنے اور چکر کھانے کے ہیں۔ عام استعمال میں اہل عرب اس سے وہ تند ہوا مراد لیتے ہیں جو تیزی سے چکر کھاتی ہوئی اٹھتی ہے۔ ایک جاہلی شاعر راعی اپنی اونٹنی کی تعریف میں کہتا ہے:

تُمْسِي إذا العِيسُ أَدْرَكْنَا نَكائثَها ... خَرْقَاءَ يَعْتَادُهَا الطُّوفَانُ وَالزُّودُ[2]

دوسری زبانوں میں بھی اس قسم کی تند ہوا کے لئے اسی طرح کے الفاظ ہیں مثلاً فارسی میں اس کو گردباد کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس کو سائیکلون (Cyclone) کہتے ہیں۔ ہندی میں اس کے لئے بگولے کا لفظ ہے۔ مصریوں کے ہاں ہوا کا ایک خاص دیوتا تھا جس کو طائفون کہتے تھے۔ اس ہوا کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے شدت کی بارش ہوتی ہے اور سمندر کا پانی جوش میں آ جاتا ہے۔ میں جب کراچی میں تھا تو اس قسم کا طوفان بچشم خود دیکھا تھا۔ بحر ہند کے مشرق سے ایک طوفان اٹھا اور مغرب کی طرف گزر گیا۔ اس کے اثر سے نہایت سخت بارش ہوئی۔ جہازات پہاڑوں سے جا ٹکرائے اور دوسرے بھی جانی ومالی بہت سے نقصانات ہوئے۔ تورات اور قرآن مجید میں طوفان نوح کے جو حالات بیان ہوئے ہیں وہ اس سے بہت ملتے جلتے ہوئے ہیں۔ سورہ قمر میں ہے: ﴿فَفَتَحْنَاۤ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۫ۖ وَّ فَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُیُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰۤى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۚ﴾[3] ہم نے آسمان کے دروازے موسلادھار بارش کے ساتھ کھول دیئے اور زمین کے تمام چشمے پھوٹ نکلے، پس پانی ٹھہرائے ہوئے اندازہ تک پہنچ گیا۔ اسی طرح تورات کی کتاب پیدائش 7/11 میں ہے: بڑے سمندر کے سب سوتے پھوٹ نکلے اور آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ سورہ ہود میں ہے: ﴿وَ هِیَ تَجْرِیْ بِهِمْ فِیْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ﴾ اور وہ کشتی ان کو لے کر ایسی موجوں کے اندر چل رہی تھی جو پہاڑوں کی طرح بلند ہو رہی تھیں۔ جن لوگوں کو سمندر کے سفر کا اتفاق ہوا ہے، وہ جانتے ہیں کہ پہاڑ کی طرح موجوں کا اٹھنا صرف اسی حالت میں ہوتا ہے جب تند ہوا چل رہی ہو۔ اس وجہ سے موجوں کا ذکر خود بخود اس بات کی دلیل ہے کہ تند ہوا موجود تھی۔ اثر کا ذکر کر کے موثر کو بتانا عربی زبان کا ایک مشہور طریقہ ہے اور قرآن مجید نے ایک سے زیادہ مقامات میں ہوا اور موجوں کے لازم وملزوم

---

1 سورۃ العنکبوت:14:29

2 ابن منظور، جمال الدين محمد بن مكرم الأفريقي، أبو الفضل، علامة، لسان العرب: 2 / 196، دار صادر، بيروت، الطبعة الأولى، 1955م

3 سورۃ القمر:54:11۔12

ہونے کو بیان کر کے ان دونوں کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کو نہایت قریب الفہم بنا دیا ہے۔ مثلاً ﴿هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ﴾ [1] وہی ہے جو تم کو سفر کراتا ہے خشکی اور تری میں، یہاں تک کہ جب تم کشتی میں سوار ہوتے ہو اور کشتی ان کو ساز گار ہوا کے ذریعہ سے لے کر چلتی ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں، آتی ہے اس پر ایک باد تند اور موجیں اٹھنے لگتی ہیں ہر طرف سے۔ علاوہ ازیں ﴿وَ هِیَ تَجْرِیْ بِهِمْ﴾ (کہ اور وہ ان کو لے چلتی ہے) کے الفاظ کے اندر خود ہوا کا ثبوت موجود ہے کیونکہ قرآن نے دوسری جگہ اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہوا کو ٹھہرا دے تو یہ کشتیاں سمندر کی سطح پر کھڑی رہ جائیں۔ ﴿وَ مِنْ اٰیٰتِهِ الْجَوَارِ فِی الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ۝ اِنْ یَّشَاْ یُسْكِنِ الرِّیْحَ فَیَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰی ظَهْرِهٖ﴾ [2] اور اس کی نشانیوں میں سے یہ پہاڑ کے سے جہازات ہیں جو سمندر میں چلتے ہیں۔ اگر خدا چاہے تو ہوا کو روک دے اور یہ سطح پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔ دوسری جگہ فرمایا ہے: ﴿وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّ لِیُذِیْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ﴾ [3] اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ بھیجتا ہے ہواؤں کو بشارت بنا کر اور تاکہ تمہیں اپنی رحمت سے شاد کام کرے اور تاکہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں۔ اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ قوم نوح پر تند اور چکر دار ہوا کا طوفان آیا جس سے سخت بارش ہوئی، پاس کے سمندروں کا پانی ابل پڑا اور ہر طرف سے موجیں اچھلنے لگیں۔ اس طوفان کے اندر نوح علیہ السلام کا سفینہ کوہ جودی پر جا کے ٹکا۔"

جمہور مفسرین کا موقف

جمہور مفسرین کے نزدیک منشائے متکلم یہ ہے کہ قوم نوح پر سیلاب اور طوفان کا عذاب آیا اور یہ پانی تنور سے پھوٹنے لگا۔ اب تنور کی وضاحت میں مفسرین سے مختلف اقوال ثابت ہیں کہ تنور سے مراد حقیقی روٹیاں پکانے والا تنور ہے یا اس سے سطح زمین مراد ہے یا اس سے بلند مقامات مراد ہیں یا اس سے صبح کا پھوٹنا مراد ہے۔ بہر حال جمہور مفسرین میں سے کسی نے بھی منشائے متکلم بیان نہ کیا جو مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔

امام طبری رحمۃ اللہ علیہ قوم نوح پر نزول عذاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"عن ابن عباس أنه قال في قوله ﴿وَ فَارَ التَّنُّوْرُ﴾ قال: (التنور) وجه الأرض قال: قيل له : إذا رأيت الماء على وجه الأرض فاركب أنت ومن معك." [4]

---

[1] سورۃ یونس: 22:10
[2] سورۃ الشوریٰ: 32:42
[3] سورۃ الروم: 46:30
[4] جامع البیان: 7/ 38

"ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول ﴿وَفَارَ التَّنُّوْرُ﴾ میں (التنور) سے مراد سطح زمین ہے۔ یعنی نوح علیہ السلام کو کہا گیا کہ آپ سطح زمین پر پانی دیکھیں تو آپ اور آپ کے ساتھی کشتی میں سوار ہو جائیں۔"

مزید فرماتے ہیں:

"عن علی قوله ﴿وَفَارَ التَّنُّوْرُ﴾ قال هو تنوير الصبح." [1]

"سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (التنور) سے مراد صبح کا طلوع ہونا ہے یعنی جب صبح طلوع ہو جائے تو آپ کشتی میں سوار ہو جائیں۔"

امام قتادہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 117ھ) اللہ تعالیٰ کے اس قول ﴿وَفَارَ التَّنُّوْرُ﴾ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"كنا نحدث أنه أعلى الأرض وأشرفها، وكان علماً بين نوح وبين ربه."

"ہم اسے زمین کے بلند مقامات (ٹیلے وغیرہ) قرار دیتے تھے اور یہ سیدنا نوح علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک علامت تھی یعنی جب بلند جگہوں سے پانی اترنا شروع ہو جائے تو آپ سوار ہو جائیں۔" [2]

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ (التنور) سے روٹیاں پکانے والا گھر کا تنور مراد ہے۔

"قال : اذا رأيت تنور أ يخرج منه الماء، فاته هلاك قومك."

"جب آپ اپنے اہل کے تنور سے پانی نکلتا دیکھیں، تو یہ تیری قوم کی ہلاکت کا وقت ہو گا۔" [3]

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ قوم نوح پر نزول عذاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"﴿وَفَارَ التَّنُّوْرُ﴾ میں لفظ (التنور) میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ عکرمہ اور زہری کے نزدیک اس سے زمین کا چہرہ (یعنی سطح زمین) مراد ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس سے طلوع فجر اور صبح کا نور مراد ہے۔ حسن بصری (متوفیٰ 110ھ)، مجاہد (متوفیٰ 104ھ) اور شعبی رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک اس سے روٹیاں پکانے والا حقیقی تنور مراد ہے اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حسن کہتے ہیں کہ یہ پتھر کا تنور تھا جس پر اماں حوا، روٹیاں لگایا کرتی تھیں۔ پھر وہ حضرت نوح علیہ السلام کی طرف منتقل ہو گیا۔" [4]

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ قوم نوح پر نزول عذاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَفَارَ التَّنُّوْرُ﴾ میں دو قول ہیں:

---

[1] جامع البيان: 7/ 38

[2] أيضاً: 7/ 39

[3] أيضاً: 7/ 40

[4] معالم التنزيل: 3 / 302

① اس سے روٹیاں پکانے والا تنور مراد ہے۔ یہ مفسرین کی ایک بڑی جماعت کا قول ہے جیسے ابن عباس رضی اللہ عنہ، حسن رحمۃ اللہ علیہ اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ۔ اب ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کا تنور تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حضرت آدم علیہ السلام کا تنور تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ پتھر سے بنا ہوا اماں حوا کا تنور تھا جو حضرت نوح علیہ السلام کو منتقل ہوا تھا۔ اسی طرح انہوں نے اس کے مقام کے بارے میں بھی اختلاف کیا ہے۔

② اس سے روٹیاں پکانے والا تنور مراد نہیں ہے۔ اس تقدیر میں پھر متعدد اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ پانی سطح زمین سے پھوٹا تھا۔ بعض نے تنور سے اونچی جگہ مراد لی ہے اور بعض نے طلوع فجر مراد لی ہے۔[1]

امام ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ قوم نوح پر نزول عذاب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"اس کی وضاحت میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک اس سے روٹیاں پکانے والا تنور مراد ہے جس میں آگ جلائی جاتی ہے۔ یہ رائے اکثر مفسرین کی ہے جن میں ابن عباس رضی اللہ عنہ اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اور ایک گروہ کا کہنا ہے کہ یہ ایک نشانی اور علامت تھی جو اللہ تعالیٰ نے سیدنا نوح علیہ السلام کے لئے عذاب آنے کے وقت کے لئے مقرر کی تھی یعنی جب تنور جوش مارے تو آپ کشتی میں سوار ہو جائیں۔"[2]

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ قوم نوح پر عذاب کی طرح، فرعون اور اس کی قوم کی تباہی میں بھی ہوا کے کردار پر ہی بحث کرتے ہیں کہ فرعون اور اس کی قوم کی تباہی ہوا سے ہوئی تھی چنانچہ وہ اپنے اس مؤقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس واقعہ میں ہوا کے عجیب و غریب تصرفات کو جو دخل ہے اور جس کی طرف قرآن نے صرف سرسری اشارہ کیا ہے، تورات نے اس کی بھی تفصیل کی ہے: سفر خروج 14 / 21 میں واقعہ کی نوعیت یہ بیان کی گئی ہے: پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر پور آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصہ ہو گیا۔"[3]

یہ آندھی پوری رات چلتی رہی اور صبح کو تھم گئی، ہوا کے زور نے سمندر کا پانی مغرب کی طرف خلیج سویز میں ڈال دیا اور مشرقی خلیج، خلیج عقبہ کو بالکل خشک چھوڑ دیا۔ پھر جب آندھی تھم گئی تو پانی اپنی جگہ پر پھیل گیا اور موسیٰ علیہ السلام کا تعاقب کرنے والی جماعت غرق ہو گئی۔ اس کی تصدیق قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے۔ سورہ دخان میں ہے: ﴿ فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۝ وَ اتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ۝ ﴾[4] "پس

---

[1] مفاتیح الغیب: 17/ 225

[2] المحرر الوجیز: 7/ 291

[3] مجموعہ تفاسیر فراہی: ص 131

[4] سورۃ الدخان: 44:22-23

میرے بندوں کو رات کے وقت نکال لے جاؤ تمہارا تعاقب کیا جائے گا اور سمندر کو ساکن چھوڑ دو۔ بے شک وہ غرق ہونے والی فوج ہے۔" ﴿وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا﴾ میں "رھو" کے معنی سکون کے ہیں اور دریا کا سکون ظاہر ہے کہ ہوا کے سکون سے ہوتا ہے۔ سورہ طہ میں ہے:﴿ وَ لَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّ لَا تَخْشٰى ۝ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ۝﴾ [1] "اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ میرے بندوں کو شب میں نکال لے جاؤ اور ان کے لئے راہ نکالو سمندر میں خشک نہ تم کو پکڑے جانے کا خوف ہوگا اور نہ ڈوبنے کا اندیشہ، تو فرعون نے اپنی فوجوں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا، پس سمندر میں سے ان کے اوپر چھا گئی جو چیز چھا گئی۔" سفر خروج 10/15 میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ترانہ حمد یوں نقل ہوا ہے: "تو نے اپنی آندھی کی پھونک ماری تو سمندر نے ان کو چھپالیا۔' تثنیہ 11/4 میں ہے: اور اس نے مصر کے لشکر اور ان کے گھوڑوں اور رتھوں کا کیا حال کیا اور کیسے اس نے بحر قلزم کے پانی میں ان کو غرق کیا جب وہ تمہارا پیچھا کر رہے تھے اور خداوند نے ان کو کیسا ہلاک کیا کہ آج کے دن تک وہ نابود ہیں۔ خلاصہ اس ساری تفصیل کا یہ نکلا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تند ہوا کے ذریعہ سے نجات بخشی اور فرعون اور اس کی فوجوں کو نرم ہوا کے ذریعہ سے ہلاک کر دیا یعنی رحمت اور عذاب دونوں کے کرشمے ہوا ہی کے عجیب و غریب تصرفات کے ذریعہ سے ظاہر ہوئے۔"[2]

جمہور مفسرین کا مؤقف

جمہور مفسرین کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے حکم سے جب موسیٰ علیہ السلام نے سمندر پر عصا مارا تو سمندر کا پانی وہیں اپنی جگہ پر رک گیا اور پہاڑوں کی شکل میں کھڑا ہو گیا۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کے لئے بارہ راستے بن گئے۔ پھر بنی اسرائیل کی فرمائش پر ان راستوں کے درمیان روشن دان بھی بنا دیئے گئے تا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے گذر جائیں۔ پھر جب فرعون اور اس کا لشکر سمندر میں داخل ہوئے تو اللہ کے حکم سے سمندر کا پانی دوبارہ رواں دواں اور جاری وساری ہو گیا کہ جس کے نتیجے میں فرعون اور اس کا پورا لشکر غرق ہو گیا۔ اس سلسلے میں فراہی صاحب نے جو ہواؤں کے کردار پر گفتگو کی ہے وہ کسی مفسر نے نقل نہیں کی، یہ ان کا تفرد ہے کہ ہواؤں نے سمندر کے پانی کو خشک کر دیا تھا اور خلیج میں جا پھینکا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پانی خشک ہو گیا تھا تو ﴿كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ﴾ [3] کے کیا معنی ہوں گے نیز ان کے راستوں میں اللہ نے دیکھنے کے لئے جو روشن دان بنائے تھے ان کی کیا ضرورت تھی؟

---

1. سورۃ طہ:20:77۔78
2. مجموعہ تفاسیر فراہی:ص 132
3. سورۃ الشعراء:26:63

امام طبری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"عمرو بن میمون الاودی رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿ وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝۵۰ ﴾[1] کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر نکل کھڑے ہوئے تو فرعون کو اس کی خبر پہنچ گئی۔ چنانچہ اس نے لشکر کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ جب دونوں لشکروں نے ایک دوسرے کو آمنے سامنے دیکھا تو بنی اسرائیل کہنے لگے کہ ہم پکڑے گئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ اپنی لاٹھی کو سمندر پر ماریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی سمندر پر ماری تو سمندر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور ہر ٹکڑا ایک بڑے پہاڑ کی مانند تھا۔ موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی سکون کے ساتھ گزر گئے۔ فرعون اور اس کے لشکر نے بھی سمندر سے گزرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ جب وہ سارے کے سارے سمندر میں داخل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے سمندر کو ان پر رواں کر دیا اور وہ سب غرق ہو گئے۔ اس حال میں کہ بنی اسرائیل دیکھ رہے تھے۔"[2]

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ اپنی لاٹھی سمندر پر ماریں۔ انہوں نے لاٹھی کو سمندر پر مارا۔ سمندر نے بات نہ مانی۔ اللہ نے پھر وحی کی کہ اس کی کنیت سے پکار کر لاٹھی مار۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر لاٹھی ماری اور کہا: اے ابو خالد! اللہ کے حکم سے پھٹ جا۔ سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک بڑے پہاڑ کی مانند تھا۔ اس میں بارہ راستے بن گئے۔ ہر قبیلے کے لئے ایک راستہ۔ اور ہر دو راستوں کے درمیان پانی پہاڑ کی مانند بلند ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا اور دھوپ بھیج کر سمندر کی تہہ کو خشک کر دیا۔ ان کی دونوں جانب پہاڑ کی مانند پانی تھا اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے خدشہ ظاہر کیا اور ہر قبیلے نے کہا کہ ہمارے بھائی تباہ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے پانی کے ان پہاڑوں کی طرف وحی کی کہ کھڑکیاں بنا دی جائیں۔ چنانچہ پانی کے ان پہاڑوں کے درمیان کھڑکیاں بنا دی گئیں۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور ایک دوسرے کی آوازیں سن رہے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے سمندر عبور کر لیا۔ اللہ کے اس قول ﴿ وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ ﴾ سے یہی مراد ہے ﴿ فَاَنْجَيْنٰكُمْ ﴾ یعنی ہم نے تمہیں فرعون اور غرق دونوں سے نجات دی۔ ﴿ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ ﴾ جب فرعون سمندر کنارے پہنچا تو کہنے لگا۔ دیکھو سمندر میری ہیبت سے پھٹ گیا ہے اور میرے بھگوڑے غلام اس میں ڈوب گئے ہیں۔ اس نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ سمندر میں داخل ہو جاؤ۔ لیکن انہوں نے سمندر میں داخل ہونے سے خوف کھایا... جب وہ سارے سمندر میں گھس گئے اور جبرئیل علیہ السلام سمندر سے نکل گئے تو اللہ

---

[1] سورۃ البقرۃ:2:50

[2] جامع البیان: 1/ 315

تعالیٰ نے سمندر کو حکم دیا کہ وہ ان تمام کو پکڑ لے۔ چنانچہ سمندر ان پر رواں ہو گیا اور وہ سب کے سب غرق ہو گئے اور سمندر کے دونوں کناروں کے درمیان چار فرسخ کا فاصلہ تھا اور یہ بحر قلزم ہے۔"[1]

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ واقعہ غرق فرعون کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرعون اور قبطیوں کو غرق کرنے کا ارادہ کر لیا تو موسیٰ کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو حکم دو کہ وہ قبطیوں سے ان کے زیورات عاریۃً لے لیں۔ اس کے دو مقاصد تھے: ا۔ تاکہ وہ اپنا مال حاصل کرنے کے لئے بنی اسرائیل کا پیچھا کریں۔ ب۔ تاکہ مال بنی اسرائیل کے ہاتھ آجائے۔ پھر رات کے وقت جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا اپنی قوم کو رات کو لے چل۔ اللہ کے قول: ﴿ وَ لَقَدْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰۤی ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ ﴾[2] سے یہی مراد ہے۔ ان کی تعداد چھ لاکھ تھی کیونکہ وہ بارہ قبیلے تھے اور ہر قبیلے کی تعداد 50 ہزار تھی۔ جب موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر نکل کھڑے ہوئے تو فرعون کو خبر مل گئی۔ اس نے کہا: مرغ کی آواز تک ان کا پیچھا نہ کرو۔ راوی کہتا ہے: اللہ کی قسم اس دن کسی مرغ نے آواز نہ نکالی۔ امام قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کے پاس 12 لاکھ افراد جمع ہو گئے اور ان میں سے ہر شخص مذکر گھوڑے پر سوار تھا... چنانچہ انہوں نے دن کے وقت بنی اسرائیل کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کے قول ﴿ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِیْنَ ﴾[3] سے یہی مراد ہے۔ یعنی طلوع آفتاب کے بعد۔ ﴿ فَلَمَّا تَرَآءَا الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤی اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴾[4] کہ جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو اصحاب موسیٰ کہنے لگے، ہم پکڑ لئے گئے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ﴾[5] کہ ہرگز نہیں، بے شک میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ میری راہنمائی کرے گا۔ جب موسیٰ علیہ السلام ان کو لے کر ساحل سمندر پر پہنچے تو یوشع بن نون نے ان سے کہا: تیرے رب نے تجھے کہاں کا حکم دیا ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: تیرے سامنے اور سمندر کی طرف اشارہ کیا... چنانچہ اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرما دی۔ ﴿ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ﴾ کہ اپنی لاٹھی سمندر پر مار یں۔ جس سے سمندر پھٹ گیا اور بارہ رستے بن گئے۔ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اس میں داخل ہو جاؤ۔ لیکن ان رستوں میں کیچڑ اور گارا تھا۔ چنانچہ باد صبا چلی جس سے سمندر خشک ہو گیا اور ہر رستہ خشک ہو گیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ یَبَسًا ﴾ تو ہر قبیلہ اپنے اپنے رستے میں داخل ہو گیا۔ پھر بنی اسرائیل کے مطالبہ پر ان

---

[1] تفسیر بغوی: 1/ 78
[2] سورۃ طٰہٰ: 20:77
[3] سورۃ الشعراء: 60:26
[4] سورۃ الشعراء: 61:26
[5] سورۃ الشعراء: 62:26

کے درمیان کھڑکیاں بنادی گئیں کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھتے جاتے تھے۔"[1]

امام ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ واقعہ غرق فرعون کے بارے میں لکھتے ہیں:

"﴿ وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ ﴾ جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر بحر قلزم کے ساحل پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ حکم دیا کہ اپنی لاٹھی کو سمندر پر مارو۔ جس سے سمندر میں بارہ رستے بن گئے اور ہر ہر قبیلہ ایک ایک رستے میں داخل ہو گیا۔ سمندر میں داخل ہونے کے بعد انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ہمارے دوسرے ساتھی تو غرق ہو گئے ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ان کے برے اخلاق کے سبب دعا کی کہ میری مدد فرما! اللہ نے کہا: اپنا عصا گھماؤ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا گھمایا تو ان رستوں کے درمیان روشن دان بن گئے کہ جن سے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے سمندر سے پار نکل گئے۔ ادھر فرعون اپنے لشکر کو لے کر ساحل سمندر پر پہنچا... آل فرعون سمندر میں داخل ہو گئی... جب وہ سارے سمندر میں داخل ہو گئے تو ان پر سمندر منطبق ہو گیا اور وہ سب غرق کر دیئے گئے۔"[2]

مذکورہ بالا تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو فرعون سے نجات دینے کے لئے سمندر کے پانی کو ساکن کر دیا تھا جو بڑے بڑے پہاڑوں کی مانند اپنی اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور پانی کے پہاڑوں کے درمیان رستے بنا دیئے گئے کہ جن میں سے وہ گزر رہے تھے۔ جب فرعون اور اس کا لشکر ان رستوں میں داخل ہوا تو اللہ تعالیٰ نے پانی کو دوبارہ جاری کر دیا اور پورے لشکر کو اس میں غرق کر دیا گیا۔ لیکن فراہی صاحب نے جو قصہ بیان کیا ہے اور اس میں ہواؤں کے کردار کے حوالے سے گفتگو کی ہے وہ قدیم مفسرین میں سے کسی کے نزدیک بھی منشائے متکلم نہیں ہے۔

قوم لوط کی ہلاکت غبار انگیز ہوا کے ذریعہ سے ہوئی

قوم لوط پر عذاب کے حوالے سے مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا موقف ہے کہ ان کی تباہی بھی ہوا کے ذریعے سے ہی ہوئی ہے۔ ان پر تیز آندھی چلی جس سے ان کے مکانات کی چھتیں زمین کے برابر ہو گئیں اور اوپر سے کنکریوں اور ریت نے ان کو ڈھانپ لیا۔ لکھتے ہیں:

"قوم لوط پر اللہ تعالیٰ نے غبار انگیز ہوا بھیجی جو سخت ہو کر بالآخر حاصب (کنکر پتھر برسانے والی تند ہوا) بن گئی۔ اس سے اوّل تو ان کے اوپر کنکروں اور پتھروں کی بارش ہوئی۔ پھر انہوں نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ اس کے زور سے ان کے مکانات بھی الٹ گئے۔ چنانچہ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

[1] تفسیر رازی: 3/ 70-71

[2] المحرر الوحیز: 1/ 288-289

﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا﴾ ان میں سے بعض قوموں پر ہم نے کنکر پتھر برسانے والی آندھی بھیجی۔ نیز فرمایا: ﴿فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ۝﴾[1] پس ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر دیا اور ان کے اوپر تہ بہ تہ سنگ گل کے پتھروں کی بارش کی۔" یعنی ایسی تند ہوائیں چلیں کہ ان کے مکانات اور چھتیں سب زمین کے برابر ہو گئیں اور اوپر سے کنکریوں اور ریت نے ان کو ڈھانپ لیا۔[2]

جمہور مفسرین کا مؤقف

جمہور مفسرین کے نزدیک قوم لوط کی بستی کو جبرئیل علیہ السلام نے جڑ سے اکھاڑ کر آسمان تک بلند کر دیا۔ پھر وہاں سے نیچے الٹا دیا گیا اور ان پر نشان زدہ پتھروں کی بارش برسائی گئی کہ جس سے وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ اس میں ہوا کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ہی مروی ایک دوسری روایت میں ہے:

"فكان اوّل ماسقط منها أشرافها."

"بستی والوں میں سے سب سے پہلے اشراف کو گرایا گیا۔"

امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"ان جیسا عذاب کسی قوم پر نازل نہیں ہوا۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں کو مسخ کیا، پھر ان کی بستی کو الٹایا اور آخر میں ان پر پتھروں کی بارش کر دی۔ ایک روایت میں ہے کہ اس بستی کے لوگوں کی تعداد 40 لاکھ تھی۔"[3]

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ قوم لوط پر نزول عذاب کے بارے میں سورہ ہود کی آیت 82 کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ امام قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"بلغنا أن جبرائيل بعروة القرية الوسطى، ثم الوى بها إلى جو السماء حتى سمع أهل السماء صواغى كلابهم، ثم دمر بعضها على بعض ثم أتبع شذاذ القوم صخرا." [4]

"ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے درمیانی بستی کے کڑے کو پکڑ لیا اور اسے لے کر آسمان کی فضا کی طرف چڑھ گئے حتی کہ آسمان والوں نے اُن کے کتوں کی آوازیں سنیں۔ پھر ان کو ایک دوسرے کے اوپر دے مارا۔ پھر قوم سے علیحدہ رہ جانے والوں کو پتھروں نے آن لیا۔ مزید فرماتے ہیں کہ وہ چار بستیاں تھیں اور ہر بستی میں ایک

---

[1] سورۃ ہود: 82:11

[2] مجموعہ تفاسیر فراہی: ص 129

[3] جامع البيان فى تأويل القرآن: 7/ 95

[4] ابن كثير، أبو الفداء، إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي، تفسير القرآن العظيم: 7/ 459، دار عالم الكتب للطباعة والنشر والتوزيع، الطبعة الأولى، 2004م

ایک لاکھ افراد رہتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ تین بستیاں تھیں اور ان میں سے بڑی بستی سدوم تھی۔"

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ قوم لوط پر عذاب کے بارے سورہ ہود میں لکھتے ہیں:

"اللہ کے قول ﴿فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا﴾ سے مراد عذاب ہے۔ اور ﴿جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا﴾ کا مطلب یہ ہے کہ سیدنا جبرئیل علیہ السلام نے قوم لوط کی الٹائی گئی بستیوں کے نیچے اپنا پر داخل کر دیا اور یہ کل پانچ بستیاں تھیں۔ جن میں چار لاکھ افراد رہتے تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ چالیس لاکھ افراد رہتے تھے۔ جبرئیل علیہ السلام ان تمام بستیوں کو اٹھا کر بلندی پر لے گئے۔ یہاں تک کہ آسمان والوں نے ان کے مرغوں کے چیخنے اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنیں۔ نہ تو ان کا کوئی برتن الٹ کر گرا اور نہ ہی سونے والا متنبہ ہوا۔ پھر جبرئیل علیہ السلام نے ان بستیوں کو الٹا کر نیچے پھینک دیا۔ ﴿وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا﴾ یعنی قوم سے علیحدہ رہنے والوں اور مسافروں پر پتھروں کی بارش برسائی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بستیاں الٹانے کے بعد ان پر پتھروں کی بارش برسائی۔"[1]

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ قوم لوط پر نزول عذاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کے اس قول ﴿جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا﴾ کی تفسیر میں مروی ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے اپنا ایک پر قوم لوط کی بستیوں کے نیچے داخل کر کے ان کو اکھاڑ لیا اور ان کو لے کر آسمان کی طرف چڑھ گئے یہاں تک کہ آسمان والوں نے ان کے گدھوں کے ہینگنے، ان کے کتوں کے بھونکنے اور ان کے مرغوں کے چیخنے کی آوازیں سنیں۔ ان کا کوئی چھوٹا بڑا بھی الٹا نہ ہوا، پھر انہوں نے ایک ہی مرتبہ ان کو الٹا کر کے زمین پر دے مارا۔"[2]

امام زمخشری رحمۃ اللہ علیہ قوم لوط پر نزول عذاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جبرئیل علیہ السلام نے اپنا پر ان بستیوں کے نیچے ڈال کر ان کو آسمان تک بلند کر دیا یہاں تک کہ اہل آسمان نے ان کے کتوں کے بھونکنے اور ان کے مرغوں کے چیخنے کی آوازیں سنیں۔ پھر ان کو الٹا دیا گیا اور ان پر پتھروں کی بارش برسائی گئی۔"[3]

امام ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ قوم لوط پر نزول عذاب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"مروی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے قوم لوط کی بستیوں کے نیچے اپنا پر داخل کر کے ان کو اکھاڑ لیا اور اوپر بلند کر دیا یہاں تک کہ آسمان دنیا والوں نے مرغوں کی چیخ اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنیں۔ پھر ان کو الٹا کر کے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ان پر آسمان سے پتھروں کی بارش ہوئی۔"[4]

---

[1] تفسیر البغوی: 3/ 323

[2] تفسیر رازی: 18/ 37

[3] تفسیر الکشاف: 2/ 393

[4] المحرر الوجیز: 7/ 369

مذکورہ بالا تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ جمہور مفسرین کے نزدیک قوم لوط پر قرآن مجید اور روایات کی روشنی میں عذاب کی شکل یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنے پر سے ان کی بستیوں کو آسمان تک بلند کر کے نیچے الٹا دیا اور پھر ان پر پتھروں کی بارش ہونے لگی کہ جس سے وہ تباہ و برباد ہو گئے۔

خلاصہ کلام

مولانا فراہی قرآن مجید کی تفسیر و توضیح میں نظم قرآن مجید کو روایات اور احادیث پر ترجیح دیتے ہیں اور اپنے فہم سے حاصل شدہ نظم قرآن کو بنیاد بنا کر ایک ایسی نئی تفسیر قرآن پیش کرتے ہیں کہ جس کا اظہار ان سے پہلے کسی مفسر نے نہیں کیا ہوتا۔ کوئی نئی تفسیر پیش کرنے کی ممانعت تو نہیں ہے لیکن دو مسئلے اہم ہیں۔ ایک یہ نظم قرآن کے ذریعے کی گئی تفسیر ہر صورت میں تفسیر القرآن بالقرآن نہیں ہوتی بلکہ بہت دفعہ میں اس میں مفسر کا فہم شامل ہوتا ہے لہٰذا مفسر اس تفسیر کو قطعی الدلالۃ قرار نہ دے، اگر تو وہ ایسا کرے گا تو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ وہ اپنے فہم کو قرآن مجید قرار دے رہا ہو اور اس سے اختلاف کو ناحق کہہ رہا ہو۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ جن نظم قرآن سے تفسیر میں مفسر کا فہم شامل ہو اور دوسری طرف یہ تفسیر بالرائے، تفسیر بالحدیث سے ٹکرا رہی ہو تو ایسی صورت میں روایت کے ذریعے تفسیر کو مفسر کے ذاتی فہم پر ترجیح حاصل ہو گی۔